رضوانہ صفدر

اسکالر پی ایچ ڈی اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

ڈاکٹر سائرہ بتول

استاد شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

پروفیسر ڈاکٹر محمد احمد قادری

ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، یونیورسٹی آف کراچی، کراچی

الطاف فاطمہ کے ناول "چلتا مسافر" میں المیہ عناصر

Rizwana Safdar
Scholar Ph.D Urdu, International Islamic University, Islamabad.
Dr. Saira Batool
Assistant Professor, Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad.
Professor. Dr. Muhammad Ahmed Qadri
Dean Faculty of Arts and Social Sciences, University of Karachi, Karachi.

Tragic Elements in Altaf Fatima's Novel "Chalta Musafir"

Being a very true yet painful depiction of human tragedy and turmoil suffered by the society and families in general and the individuals, especially Muzammil and Naseebia of Bihar, in particular, Altaf Fatima's novel "Chalta Musafir" deals with and revolves around the same phenomenon that emerged following partition of the sub-continent and later in the wake of the separation of the East Pakistan, now Bangladesh, from the West Pakistan. An attempt has been made in this article to identify and analyse the salient features of the subject novel, thus, corelating between the catastrophic consequences of political decisions, religious divide and ethnic differences and the resultant sufferings, agony and chaos as well as the cost paid by innocent and helpless individuals for the sins committed by others.

Key Words: *Painful, Depiction, Tragedy, Turmoil, Muzammil, Altaf Fatima, Separation, Innocent, Helpless.*

ناول ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں وقت، حالات اور انسانی زندگی کی عکاسی اس طرح کی جاتی ہے کہ حقیقت پوری جزئیات کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔ ناولوں میں مصنفین نے اپنی طرف سے دو جہان کو سمونے کی

کوشش کی ہے۔ طبیعاتی اور مابعد الطبیعاتی ہر دو طرح کے موضوعات ، طبقاتی کشمکش، معاشرتی ، اخلاقی ، سماجی اور تاریخی معاملات و مسائل سے لے کر مذہبی تشریحات تک کون سا موضوع ہے جو ناول کے احاطے سے باہر ہے اور ادب کی وہ کون سی تکنیک ہے جسے ناول میں برتا نہ گیا ہو۔ غرض یہ کہ ناول انسانی حیات سے ما قبل اور مابعد ہر دو طرح کے معاملات و مسائل کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

الطاف فاطمہ نے اپنے ناولوں میں ہندوستان کے سیاسی و سماجی انتشار اور بحران کو موضوع بنایا ہے۔ خاص طور پر متحدہ ہندوستان اور بعد از تقسیم اہل ہند کی سیاسی و سماجی، ذہنی و اخلاقی، معاشی و معاشرتی سرگرمیاں اور ثقافتی تبدیلیاں ان کے ناولوں کی فضا متعین کرتی ہیں اور اسی سے ان کا المیہ ظہور پاتا ہے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہندوستان کے معاشرتی ڈھانچے میں ہندو مذہب کے رسوم و رواج خاصی گہرائی میں نفوذ کیے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں ذات پات کی تفریق سے لے کر توہم پرستی تک ہر معاشرتی فرسودگی کی جڑیں خاصی مضبوط ہیں۔ اس کے بعد اسلامی معاشرت کے اثرات اور سامراجی یورش کے تہذیبی تصادم نے یہاں کی فضا پر جو مثبت منفی اثرات مرتب کیے انھوں نے ہندوستان کے معاشی معاشرتی اور ثقافتی ڈھانچے کو خاصا پیچیدہ بنا دیا ہے۔ بلاشبہ یہ ایسے معاملات اور مسائل ہیں جنھیں ہندوستان کے دانشوروں نے بہت عمق نظر سے اپنا موضوع بنایا اور اس کا خاصی گہرائی سے تجزیہ کیا۔

الطاف فاطمہ کا ناول اسی سلسلے کی کڑی ہے جس میں انھوں نے تقسیم در تقسیم اور ہجرت کے عمل پر اپنے المیے کی بنیاد رکھی ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اپنی جنم بھومی کو چھوڑ دینا انسان کے لیے بے انتہا کرب کا باعث بنتا ہے کیوں کہ وطن میں اس کے صرف جسمانی خد و خال ہی نہیں پرورش پاتے بل کہ اس کی باطنی شخصیت کی بھی تعمیر ہوتی ہے۔ اس کی محبتوں، نفرتوں اور تعصبات کی تشکیل میں جغرافیائی سرحدوں کے حقائق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اہل بنگال اس معاملے میں برصغیر کے دوسرے مسلمانوں سے زیادہ بد نصیب ثابت ہوئے کہ انھیں ہجرت اور تقسیم کے عمل سے دوبار گزرنا پڑا۔ پہلے ہندوستان کی تقسیم اور پھر مشرقی و مغربی پاکستان کی تقسیم نے ان کے ظاہر و باطن میں خاصی شکست و ریخت کی۔

الطاف فاطمہ نے ''چلتا مسافر'' میں بہار کے ایک ایسے زمیں دار گھرانے کی رودادِ کرب بیان کی ہے جس کی خوش حال زندگی کو پاکستان کے خواب نے درہم برہم کر دیا۔ پاکستان کی حمایت کرنے اور مسلم لیگ میں شمولت کی سزا بہار کے مسلمانوں کو بھگتنا پڑی۔ خون کی ہولی تو تقسیم کے دوران سارے ہندوستان ہی میں کھیلی گئی مگر

بہاریوں کے اس جذبے کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی کہ وہ جس پاکستان کی حمایت کے لیے اپنی جان ومال اور عزت و آبرو کی قربانی کے لیے مستعد تھے وہ مسلم اکثریتی صوبوں کے اس مطالبے کی حدود میں نہیں تھا جسے پاکستان بننا تھا اورانھیں یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ پاکستان کے جغرافیے میں اتنی گنجائش موجود نہیں ہوگی کہ اس میں تمام ہندوستان کے مسلمان سما سکیں مگر اس کے باوجود مسلم قوم کے افراد کی حیثیت سے ان کے دل پاکستان کے لیے دھڑکتے تھے۔

مزمل کا خاندان بہار کے ان خوشحال، متمول زمیں دار گھرانوں کی قربانی کا ایک نمونہ ہے جنھوں نے پاکستان کے لیے اپنا سب کچھ لٹادیا اور پھر ہجرت کا کرب سہنے کے بعد بھی انھیں وہ سکون حاصل نہ ہوسکا جس کا تصور کر کے انھوں نے اپنا گھر بار، عیش و آرام سب کچھ دان کر دیا تھا۔ اگر وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ ہندوستان کے ان تمام مسلمانوں کا المیہ ہے جو نجانے کیسے کیسے خواب سجائے اور امیدیں دلوں میں بسائے ایک نوزائیدہ مسلمان ملک میں آگ اور خون کا دریا پار کر کے آئے تھے۔ فیض احمد فیض نے "یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر" کہہ کر دراصل ان تمام خواب دیکھنے والوں کی ترجمانی کی ہے جنھیں ان کی خواب کی تعبیر نہیں مل سکی، لیکن کیا یہ المیہ ان مسلمانوں کے لیے زیادہ روح فرسا نہیں ہوجاتا جو پہلے مذہب کے نام پر ہندوستان کی تقسیم کے بعد اپنے گھر بار لٹا کر مشرقی پاکستان آئے اور پھر لسانی بنیادوں پر اپنے خوابوں کے اس تاج محل کو مسمار ہوتے دیکھ کر خوار وزبوں ہوگئے؟ ہندوستان کے دیگر علاقوں کے مسلمانوں نے تو ہجرت کے کرب کو ایک بار سہ لیا اور جیسے تیسے اپنے جی کو سمجھا کر ماحول سے مطابقت اختیار کرلی اور آخر کار نئے ماحول میں اپنی جگہ بنانے میں مصروف ہوگئے لیکن بہار کے مسلمان جنھوں نے مشرقی پاکستان ہجرت کی اور اس وطن کو جی جان سے اپنا سمجھا اس بات سے بے خبر رہے کہ ایک دن انھیں تقسیم کے کرب کو دوبارہ سہنا پڑے گا۔ وہ تقسیم جو اسلام کے نام پر نہیں بل کہ ایک اسلامی ملک میں جغرافیائی قومیت اور لسانی تعصب کی بنا پر کی جائے گی۔

یہاں آگ اور خون کے جو دریا بہیں گے، کنواریوں کی عصمت دریاں ہوں گی، اخلاق اور انسانیت کی دھجیاں اڑائی جائیں گی، ان میں پرائے ہی نہیں اپنے بھی شریک ہوں گے۔ ہندوستان سے پاکستان اور پھر پاکستان سے بنگلہ دیش بننے کا یہ عمل صرف تاریخ ہی نہیں بنگالی مسلمانوں کے دل کا بھی گہرا داغ ہے۔

تقسیم اور ہجرت کا وسیع تناظر اس ناول کا بڑا المیہ ہے مگر اس کی بنت میں چھوٹے بڑے کئی اور المیوں اور المیہ کرداروں کا بھی خاصہ بڑا حصہ ہے۔ ناول جب شروع ہوتا ہے تو اس میں "نصیبیا" کا کردار سب سے پہلی توجہ

حاصل کرتا ہے جو ایک لاوارث ملازمہ ہے اور سید صاحب کے گھر میں پرورش پاتی ہے۔ ۱۲ سال کی عمر میں اس کی شادی کر دی جاتی ہے۔ شادی کے چند ہی مہینوں میں اس کا شوہر ''بشروا'' بقر عید کے دن گائے کے ذبیحہ کے تنازعے پر ہندو بلوائیوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے اور وہ بے چاری بچپنے ہی میں بیوگی کا داغ دامن پر سجائے سید صاحب کے گھر واپس آجاتی ہے۔ ۱۲ سال کی عمر میں بیوہ ہو جانا کسی عورت کے لیے بہت بڑا سانحہ اور روگ ہے خاص کر اس سماج میں جہاں ہندوانہ رسوم گہرائی میں نفوذ کر چکی ہوں، مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ''بیوگی'' نصیبیا کا المیہ نہیں ہے۔ اس کا المیہ یہ ہے کہ اسے مزمل سے محبت ہے جو ایک ایسے بڑے زمیں دار گھرانے کا خوبصورت چشم وچراغ ہے جس نے نصیبیا جیسے کئی لاواثوں کو سہارا دے رکھا ہے۔ نصیبیا جو ایک کالی کلوٹی ملازمہ ہے اپنے اس احساس کی کراہیت سے بہ خوبی واقف ہے مگر وہ مزمل جسے منجھلے بھیا کہتی ہے، کی ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکیوں میں اپنی محبت کا سکون تلاش کرتی ہے اور اسی گھر میں اسی حالت میں تمام زندگی گزار دینا چاہتی ہے۔ وہ اس کا اظہار نعیم سے یوں کرتی ہے:

"نعیم بھیا تم کو کیا کھبر ہے۔ منجھلے بھیا کی ڈانٹیں اور چیخم دھاڑ تو میری جندگی ہے۔۔۔
چاہے آپ سرکار بیگم ہی سے کیوں نہ کہہ دیں، نعیم بھیا آج میں آپ کو بتاتی ہوں۔ میں
ان کو دیکھے بنا جندہ رہ سکتی ہوں، یہ تو کبھی میں سوچ ہی نہیں سکتی۔"(۱)

اس کے برعکس مزمل کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایک نرم دل اور حساس انسان ہے۔ وہ نعیم اور نصیبیا کی گفتگو سن کر نصیبیا کے اس راز سے واقف ہو جاتا ہے مگر نصیبیا سے ہمدردی رکھتے ہوئے بھی اس کو اپنا نہیں سکتا مزمل کو اپنے بھائی مدثر کی بیوہ سے شادی کرنی پڑتی ہے لیکن بنگلہ بلوائیوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر وہ نصیبیا کی آغوش ہی میں آتا ہے اور بقول نصیبیا منجھلے بھیا کا خون اس کے قدموں میں گرتا ہے۔ لیکن مزمل کا بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ ایک اردو بولنے والا بہاری مہاجر ہے جو تحریک پاکستان سے وابستہ تھا۔ وہ اپنا سب کچھ لٹا کر ڈھاکہ میں پناہ گزین ہوا تھا۔ اس امید پر کہ وہ اپنی منزل پاکستان میں اپنا کھویا ہوا وقار اور مقام حاصل کرے گا، مگر وہ قابل اور اہل ہونے کے باوجود بھی اپنی صلاحیتوں کو پاکستان کے لیے استعمال نہیں کر سکتا۔ اس پر اردو بولنے والے مہاجر کا ٹھپہ ہے۔ لہٰذا وہ جو بھرا پرا گھر اور زمین داری کی شان وشوکت چھوڑ کر اپنا صرف انٹلکٹ لیے پاکستان آتا ہے، کریانے کی ایک دوکان اور مصلےٰ سنبھال کر اپنی زندگی کو وقت کی بے رحم موجوں کے سپرد کر دیتا ہے لیکن اس پر بھی اس کے ہواس مختل نہیں ہوتے۔ اس کا اظہار وہ اپنے پڑوسی بنگالی لڑکے بزلل سے جو اسے بہت پیارا ہے ان الفاظ میں کرتا ہے۔:

"تم اطمینان رکھو، میں پاگل ہونے کی اہلیت کھو چکا ہوں۔ اگر میں پاگل ہو سکتا تو اس وقت ہوتا

جب میں کٹے ہوئے سر الگ اور دھڑ الگ دیکھا کرتا تھا۔ میں اس وقت پاگل ہوتا جب میں نے ایک دن اپنے بھائی کے زخموں سے چور جسم کو مٹی کے سپرد کیا اور دوسرے دن اپنے باپ کا جنازہ کندھوں پر اٹھا کر چلا۔۔ جب میں نے تین لٹی ہوئی عورتوں کی ان کلائیوں کو ننگا دیکھا جن میں سونے کی چوڑیاں جگمگاتی تھیں۔۔۔ جب کیمپ میں نیم بے ہوشی کے عالم میں میرا نکاح میری بڑی بھاوج سے پڑھادیا گیا۔"[۲]

درج بالا پیراگراف مزمل کی زندگی کے تمام المیے کا احاطہ کرتا ہے۔ آخر کار مزمل ڈھاکہ کے مہاجر کیمپ میں بنگلہ بلوائیوں کے ہاتھوں زخمی ہوکر جان جان آفریں کے سپرد کر دیتا ہے۔ مہاجرت کے اس کرب کو کہانی کی صورت میں الطاف فاطمہ نے بڑے دل کش انداز میں قلم بند کیا ہے تمام ناول میں خود ادیب کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے جیسے کہ کہانی لکھنے والا تمام واقعات کا چشم دید گواہ ہو۔ شہزاد احمد لکھتے ہیں کہ:

"پاکستان کے افسانوں اور ناولوں میں ہجرت کے کرب کا اظہار ان ادیبوں نے کیا جو ہجرت کر کے نئے ملک پاکستان آئے تھے۔۔۔ انھوں نے ہجرت تو کی مگر اپنی یادوں میں آبائی وطن کو بسائے رکھا۔ یہ بات خاص طور پر ہندوستان سے آئے ادیبوں کی تحریروں میں پائی جاتی ہے۔ یہ کرب اس وقت مزید بڑھ جاتا ہے جب انھیں اور اس طرح کے دوسرے لوگوں کو ان کی امیدوں اور خوابوں کی سرزمین پاکستان میں اپنی حیثیت کا احساس ہوتا ہے۔"[۳]

"چلتا مسافر" بہار کے ایک متمول خاندان اور اور اس کی تباہی کا المیہ ہے مگر صرف یہ خاندان ہی ختم نہیں ہوا، اعلیٰ انسانی تہذیب کا بھی گلہ گھونٹ دیا گیا، انسانوں سے انسانیت ختم ہوگئی، بے حسی انتہا کی سرحدوں تک پہنچ گئی۔ وہ انسان جو اس دنیا میں آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے نائب کی حیثیت سے اشرف المخلوقات کا درجہ از خود حاصل کر لیتا ہے اور جب اس دنیا سے جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے تب بھی عزت کا تاج اس کے ہی سر پر رکھا۔ اسے عزت کے ساتھ غسل دے کر کفن پہنا کر سب مل کر دعاؤں کے سائے میں سپرد خاک کرتے ہیں۔ سسکیوں اور آہوں میں اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ یہ اعزاز کسی اور مخلوق کو نہیں دیا گیا مگر جب انسان ذلت کے گڑھوں میں گرا اور اس میں سے انسانیت ختم ہوئی تو اس اشرف المخلوقات نے درندوں سے بھی زیادہ بھیانک روپ دھارا جس کے خوف سے انسان اپنے پیاروں کی لاشوں کو دفن کرنے کے بجائے کوڑے کی ٹرالیوں میں پھینکنے پر مجبور ہو گئے بلکہ بعض اوقات

لاشوں کے ڈھیر پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی جاتی نہ جنازہ پڑھا گیا نہ قبر بنی نہ فاتحہ خوانی ہوئی نہ بینوں نے سننے والوں کے دل چھلنی کیے۔ ایسی بے حسی تو پتھروں میں بھی نہ پائی جائے ایک ماں وہ تھی کہ جس نے اپنے لختِ جگر کی پیاس بجھانے کے لیے چکر کاٹے تو ماں کا کرب دیکھ کر قدرت بھی موم ہو گئی اور چشمہ جاری کر دیا اور اس کے اس عمل کو عبادت کا درجہ دے دیا، ایک ماں وہ تھی کہ جس نے عیسیٰؑ کو جنم دیتے ہوئے تکلیف میں ایڑی رگڑی تو چشمہ پھوٹ نکلا لیکن اسی عقیدت اور اسی مذہب کے پیروکار تھے مگر اب کس بے دردی سے کتنی ماؤں کے لختِ جگر ان کی آنکھوں کے سامنے بے گوروکفن پھینکے اور جلا رہے تھے نہ آسمان رویا نہ زمین پھٹی۔ ایک قیامت آئی اور اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ سب کچھ ختم کر گئی۔ اب جس معاشرے نے جنم لیا اس میں رحم، نیکی، انصاف اور خلوص کے بدلے ریاکاری، بدگوئی، نفس پرستی، ظلم و استحصال اور آبروریزی کا ناپاک جذبہ پیدا ہو گیا۔ ایک رسول و خدا کے ماننے والوں میں جن کو ان کے رب نے یہ کہہ کر انما المؤمنون اخوۃ بھائی بھائی بنایا تھا، ان میں یہ فرعونیت کہاں سے آ گئی تھی۔ اس دلسوز منظر کی عکاسی الطاف فاطمہ کے اس اقتباس سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

> "قبرستان جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ قبرستان تو پھیل کر گلی محلوں تک آ گیا تھا جس طرف جانکلو دس پانچ دھڑ، کٹے ہوئے بے شمار اعضا اور ننھے ننھے بچوں کی لاشیں پڑی نظر آتیں۔ پھر چند لوگ کھرپالیں اور بیلچے لیے آتے۔ بڑے بڑے گڑھے کھود کر مشترکہ قبریں بنا دیتے۔ کبھی دو کبھی تین آدمی صف بستہ ہو کر ان بے گوروکفن لاشوں کے جنازے بھی پڑھ لیتے اور پھر گڑھے بند کر دیتے۔ وہ نہ آتے تو کچھ لوگ پٹرول اور مٹی کے تیل کے ٹین اٹھائے آتے، پٹرول چھڑکتے اور آگ لگا دیتے اور کبھی کبھار ایک ٹرک آتا، سارے بکھرے ہوئے اعضا سمیٹ کر کوڑے کرکٹ کی طرح بھر کر لے جاتا اور موجوں کے حوالے کر دیتا۔"(۴)

یہ رہ گئی تھی اشرف المخلوقات کی اوقات۔ یوں "چلتا مسافر" رونگٹے کھڑے کر دینے والی ادبی دستاویز ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں: الطاف فاطمہ نے واقعات کے فطری بہاؤ کو قائم رکھا اور المیہ صورت کو فنی چابکدستی سے مجسم کر دیا ہے۔"(۵)

اس ناول میں ذہنی، سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی انتشار کو موضوع بنایا گیا۔ "چلتا مسافر" تقسیم ہند سے پہلے اور بعد کے المناک واقعات و حالات سے عبارت ہے۔ مسلمانوں کا آزادی کے حصول کی خاطر جدوجہد

کرنا اور ہجرت کے بعد وہ جس عدم تحفظ کا شکار رہے ہیں خاص طور پر سقوطِ ڈھاکہ کے بعد وہ جس مایوس کن صورت حال سے نبرد آزما ہوئے وہ سارا منظر نامہ مذکورہ ناول کا موضوع ہے۔ "چلتا مسافر" کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے موضوع میں معنویت اور تہ داری موجود ہے یعنی وہ سر زمین جس کی خاطر ہر مقام پر بہاریوں نے کش مکش سہی، حقیقت میں اس پر بسنا اور اپنے گھروں میں آباد ہونے کی خوشی اُنھیں نصیب نہ ہوئی۔ الطاف فاطمہ نے اس ناول میں غیر جانبدارانہ اور حقیقت آموز انداز میں بہت کچھ کہہ دیا۔ ہندو مسلم معاشرے اور بعد میں مسلم معاشرے میں تہذیبی قدروں کی شکست وریخت کے خاکے نمایاں ہو کر سامنے آئے۔

حصول آزادی اور پاکستان کی تشکیل کے بعد تمام واقعات کو تاریخی ترتیب سے آگے بڑھایا ہے اور اس طرح وہ بنیادی انتشار سامنے آجاتا ہے جیسے یقیناً پیدا ہونا ہی تھا یعنی سانحہ مشرقی پاکستان۔ اس دور میں ہندوستان خاص کر بہار کے مسلمان شدید طور پر بحران کا شکار ہوئے۔ تقسیم کسی بھی قسم کی ہو محبتوں کی ہو یا زمین یا تہذیبی قدروں کی بنیادی طور پر المیہ ہی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ تقسیم کے وقت جو مسلمان ہندوستان رہ گئے تھے انھیں اپنے ہی وطن میں مختلف قسم کے سیاسی نشیب و فراز کا تجربہ کرنا پڑا۔ ادھر مشرقی پاکستان کے بہاری مسلمان ایک نئے ذہن و کلچر کے تحت منتقل ہوئے لیکن خود مشرقی پاکستان میں جو آزادی کی لہر موجود تھی اور بنگالی جو رویہ اختیار کرنے والے تھے۔ اس سے یہ ناآشنا تھے۔ الطاف فاطمہ نے اس سلسلے میں بھی گہری فکر کو اُجاگر کیا ہے اور واقعات کو ایسے پیش کیا ہے جس سے اس بہاری طبقے کا مجموعی دکھ اور کرب واضح ہوتا ہے۔ بہاری مسلمان جس نئے کرب سے دوچار ہوئے وہ بھی اپنی جگہ تاریخ کا پُر درد واقعہ ہے اور اس کرب و اضطراب کی افسوسناک اور المناک تصویر کشی "چلتا مسافر" میں کی گئی ہے۔ ایک ہی ملت و مذہب کے دو علاقوں کے لوگ کتنی شدید نفرت، قتل و غارت اور تہذیبی بحران کے شکار ہوئے اس کی بھرپور عکاسی اس ناول میں ملتی ہے۔

ناول کا کینوس وسیع ہے۔ جنگ عظیم، برصغیر کی تقسیم اور پاکستان کی تقسیم کے اثرات کے نتیجے میں تاریخ کے بدلتے دھارے نے معاشرت اور تہذیب کا رنگ ڈھنگ بدل دیا اور اس تبدیلی نے نسلوں کو متاثر کیا۔ ناول کی کئی جہتیں ہیں:

> "مزمل بہاری مسئلے کی ایک علامت بن کر تحریک پاکستان کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوا مشرقی پاکستان پہنچا۔ یہ سفر روح اور پیکر کے اشتراک سے جاری ہوا اور منزل پر پہنچ کر بھی تمام نہ ہوا۔ سفر جاری رہا، طور بدل گیا۔ اب پیکر نے قیام کیا اور روح ایک بہتر سفر

پر روانہ ہوئی۔ ایسا سفر ایک روح سے گزر کر دوسری روحوں اور اجسام میں منتقل ہوتا ہے تو کبھی موروثی طور پر اور کبھی ذہنی طور پر۔ مزمل کا سفر تمام ہوا تو اس سے بہت پہلے ہی دوسری روحوں اور اجسام میں منتقل ہو چکا تھا اور یوں اس چلتے مسافر کا سفر جاری رہتا ہے۔ مختلف سمتوں اور جہتوں میں کبھی مدثر کی صورت، کبھی بذلل بن کر اور کبھی مرلی کا روپ دھار کر چلتا مسافر چلتا ہی رہتا ہے۔"(۲)

یوں تین نسلوں کی یہ آزمائش اس ناول کو المیہ ناول بناتی ہے جن کی زندگیاں، ہجرتوں کی تکالیف اور ماضی کی ٹیسوں کو سہتے گزریں جو خوشی اور سکون کے ایک پل کو ترستے رہے اور روح اور جسم کا تعلق ٹوٹ گیا۔ وقت کا خاموش سیلاب ان کی خوشیوں اور خوابوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ بیشتر کردار تقدیر اور حالات کی ستم ظریفی کا شکار بنے۔ مزمل اس کی ماں، دلہن بیگم، نصیبیا، سلسبیل، بذلل اور مدثر سب اپنی اپنی زنجیروں میں مقید رہے۔ ان زنجیروں کو توڑ کر نکلتے ہیں تو نئے حصار میں جکڑے جاتے ہیں کیونکہ انسان تو ازلی اور ابدی طور پر مجبور ہے۔ مدثر ڈھاکہ سے بذلل کے کہنے پر فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر پھر اس کی آزمائشوں کا نیا دور شروع ہو جاتا ہے۔ سلسبیل پنجاب پہنچ جاتی ہے لیکن ماں باپ کی گمشدگی اور بذلل کی جدائی کا کرب ایک پھانس بن کر ساری زندگی ستاتا رہتا ہے۔ مزمل اور بذلل اپنی اپنی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش میں منہمک رہتے ہیں لیکن کسی رشتے کو بھی آسودہ نہیں کر سکتے، نہ ہی اُن کے دکھوں کا مداوا بن سکتے ہیں۔ سب تقدیر کے حصار میں جکڑے ہوئے ہیں۔ آزادی کی مسلسل کوشش میں کامیاب یا ناکام ہونے پر کسی کا کوئی اختیار نہیں کیونکہ بقول مصنفہ زندگی کے فیصلوں پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا ہے۔

ہجرت کے سفر میں اپنے عزیزوں کا کھلے عام قتل کیے جانے پر مزمل ایک عجیب قسم کی دیوانگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس وقت لوگوں پر نفسا نفسی کا عالم چھایا ہوا تھا کیونکہ ہر انسان صرف جان بچانے کی کوشش میں تھا اور وہ ہمدردی اور وفاشعاری کا جذبہ ختم ہو چکا تھا جو کسی عزیز کی موت پر آنسو بہانے پر مجبور کرتا ہے۔ گویا ایک ایسا نفسا نفسی کا عالم برپا ہو چکا تھا جس میں کوئی بھی انسانی و تہذیبی عنصر باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ الطاف فاطمہ نے اپنے ناول میں یہ ثابت کر دیا کہ جب انسان خود غرضی، فرقہ پرستی، لالچ، حرص و ہوس کو اپنا کر ذہنی، سیاسی، مذہبی و سماجی اور اخلاقی بندشوں کو توڑ دیتا ہے تو تب ایسی ہی صورت حال جنم لے لیتی ہے جیسا کہ "چلتا مسافر" میں بیان کی گئی ہے اور یہ صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسانیت کے ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھنے والے دو طبقے ایک دوسرے کو

موت کے گھاٹ اتارتے ہیں۔ ایک دوسرے کے گھروں کو جلا کر خوش ہوتے ہیں اور عورتوں کی عصمت دری کر کے اپنی مردانگی کا کھلا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس وقت چہرے اور عقیدے مٹ گئے اور یہ ایسے بدنصیب لوگ تھے جو مظلوم بھی کہلائے اور ظالم بھی کیونکہ ان کے اندر وہ تمام اقدار مٹ چکی تھیں جو کسی قوم کا امتیازی نشان ہوا کرتی ہیں۔ ان لوگوں میں وہ تمام اخلاقی ضابطے ختم ہو گئے تھے جن کی وجہ سے انسان میں تہذیبی شناخت پیدا ہوتی ہے۔

"چلتا مسافر" ایک ایسا ناول ہے جس میں الطاف فاطمہ نے موضوعاتی اعتبار سے تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت کو اُجاگر کیا ہے اور ان پسماندہ انسانوں کی لاچاری، محرومی اور دکھ درد کو پیش کیا ہے جن کو ہجرتوں کے عمل نے مضمحل اور اعصاب زدہ کر دیا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم جو انگریزوں کی ناپاک فتنہ پرور سازش کا نتیجہ تھی کمزور اور بے بس بہاریوں کے لیے مزید تباہی و بربادی اور بدنصیبی کا سامان لے کر آئی تھی۔ گویا اس ناول کو انسانیت کے قتل کا نوحہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں تقسیم کے بعد آدرشوں کی ٹوٹ پھوٹ کا المیہ بھی بیان کیا ہے اس صورت حال کی ذمہ دار تقدیر اور وقت کو ٹھہراتے ہوئے مصنفہ نے دنیا کی بے ثباتی کا تصور پیش کیا ہے۔

الطاف فاطمہ نے تقسیم برصغیر کے بعد آدرشوں کی ٹوٹ پھوٹ کا المیہ بیان کرتے ہوئے وقت اور تقدیر کو اس صورت حال کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور اس طرح دنیا کی بے ثباتی تقدیر کی جبریت اور وقت کی ابدیت کا تصور پیش کیا ہے۔ وہ تاریخ کے ہر دور میں اس انسان کے مقدرات کا جائزہ لیتی ہیں جو تاریخ کے تجربے کی آگہی اور تلخی برداشت کرتا ہے۔ معاشرتی ماحول کی بدلتی پیچیدگی اور انسانی نفسیات پر پڑنے والے اثرات کی بدولت یہ بتانے کی کوشش کرتی ہیں کہ انسان اپنی تقدیر کے سامنے مجبور بھی ہے اور تغیرات زمانہ کا بے بس شکار بھی۔ وہ تقدیر کے تصور کو اپنے ناولوں میں ایک جبر کی صورت میں پیش کرتی ہیں۔ ان کے ناولوں کے مرکزی کردار مزمل، گیتی، ابراہیم، نادر، روبینا سب وقت اور تقدیر کی قید سے نکلنے اور حالات کو اعتدال پر لانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں مگر بالآخر ناکام ہی رہتے ہیں۔ یہی حقیقت ہے کہ انسان کی زندگی کا پورا لائحہ عمل پہلے سے تیار ہو چکا ہے انسان تو بس اس کے تحت زندگی بسر کرتا ہے بقول ڈاکٹر ناہید قمر:

> تقدیر کے اس جبر میں اختیار کی صرف یہ صورت سامنے آتی ہے کہ ایک خاکہ پہلے سے قدرت تیار کر چکی ہے جس میں رنگ ہمیں بھرنا ہے۔ خاکے کی لکیروں سے انحراف نہیں ہے۔[۷]

اس ناول میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب ان جذبات میں شدت آتی ہے تو کیسے کیسے المناک سانحات وقوع پذیر ہو جاتے ہیں۔ ہاجرہ جو ایک پاگل اور بے ضرر عورت ہوتی ہے اُسے محض اس لیے قتل کر دیا جاتا ہے کہ مزمل جو کہ بہاری ہے اس کی تیمارداری کرتا ہے اور اس کی ہر ضرورت پوری کرتا ہے۔ کچھ لوگ اس مغالطے میں تھے کہ چونکہ مزمل اور اس کا خاندان اس کی خبر گیری کرتے تھے اور اس کے معاملے میں بہت دلچسپی لیتے تھے اس لیے یہ ضرور بہاری یا اردو سپیکنگ مہاجر ہو گی۔ اس طرح لسانی تعصب نے کئی معصوم لوگوں کی جان لے لی۔ قیام پاکستان کے وقت جو تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس میں لاکھوں انسان برباد ہوئے کئی قافلے راہ میں لُٹ گئے جو زندہ پاکستان پہنچے انھیں پاکستان میں وہ عزت اور وقار حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ پاکستان میں ہمیشہ مہاجر کہلائے اور بھارت میں غیر مسلم کے نام سے علاقائی و صوبائی تعصب کی بنا پر ہمیشہ کمتر اور حقیر ہی جانے گئے۔ یوں ہجرت کا معاملہ انسانی المیوں کی وجہ سے ایک بڑا المیہ نظر آتا ہے۔ ہجرت کے وقت قتل و غارت گری کے مناظر سے دونوں اطراف کے لوگ ذہنی اور جسمانی طور پر متاثر ہوئے۔ اس المیے نے کئی نفسیاتی و سماجی و قومی مسائل کو جنم دیا۔

الطاف فاطمہ نے بھی کہیں انسان کی انسان پر درندگی کی داستان سنائی ہے تو کہیں مکتی باہنی کے مظالم کی منہ بولتی تصویر پیش کی۔ ان کا ناول درحقیقت فرد کے لاشعور کی جڑیں تلاش کرنے کی ایک کوشش ہے۔ "چلتا مسافر" میں سفر کو ہجرت، آگہی اور فنا کے تصور کے ساتھ لیا گیا ہے۔ اس میں اپنی جڑوں سے کٹنے کا غم ہی نہیں بلکہ نئی سرزمین میں اپنی جڑوں کی تلاش کا کرب بھی بیان کیا گیا ہے۔ الطاف فاطمہ نے انسان کی شخصیت کے گم شدہ حصوں کی تلاش کے ساتھ ساتھ اس نقطہ نظر کی اہمیت کا بھی احساس دلایا ہے کہ اپنے منفرد تہذیبی رویوں اور اپنی وراثت کے شعور سے دستبردار نہیں ہونا چاہیے۔ ان کے فکری نظام کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کا فکری نظام اپنے عہد کا تہذیبی و سماجی انتشار اور وقت اور تقدیر کے لگائے ہوئے زخم ہی ہیں۔

مختصراً الطاف فاطمہ ایک رزم نگار خاتون ہیں۔ انھوں نے اپنے کرداروں کے اعمال و حرکات کی حدود کو اور حوادث کے دائرے کو وسیع کر کے ٹریجیڈی کو تخلیق کیا ہے اور ایسا کرنے کے لیے انھوں نے ٹریجک اوصاف کے کرداروں کو جنم دیا ہے۔ ان کے ناول دہشت، خوف، سنگ دلی اور بے رحمی کو اپنے ہمراہ لیے چلتے ہیں۔

ان کے ناولوں کا موضوع زندگی اور اس کی اخلاقی قدریں ہیں۔ انھوں نے نہ صرف ہند مسلم تہذیب کی عکاسی کی ہے بلکہ ان کے ہاں ایک تہذیب کی موت سے دوسری تہذیب کی پیدائش کا عمل حقیقت پسندانہ انداز میں ملتا ہے۔ انھوں نے تہذیبوں کے زوال کی تصویر کشی تجزیاتی اسلوب کے بجائے کرداروں ،انسانی جذبوں اور

احساسات کے عمل اور ردعمل کے وسیلے سے بیان کی ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں ہند اسلامی ثقافت کو منعکس کرتے ہوئے معاشرتی حقائق کو دیانتداری اور غیر جانبداری سے بیان کرتی ہیں اور ہند اسلامی ثقافت کے حوالے سے پیدا ہونے والے سوالات کو ہجرت اور اس کے بعد کے مسائل کے تناظر میں سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں۔

ان کے ہاں وجودی فلسفے کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ وجودی فلسفے کا کہنا ہے کہ انسان بے بس ہے اور مجبور ہے اپنے تمام تر خیالات کے باوجود بے اختیار ہے اس لیے مایوس ہے کیونکہ وہ تمام عمر ایک صورت حال سے گزرتا ہے وہ ایک مشکل کا خاتمہ کرتا ہے تو دوسری صورت حال اس کی منتظر ہوتی ہے۔ گویا انسان تمام عمر کش مکش میں گزار دیتا ہے۔ "چلتا مسافر" ایسی ہی صورت حال لیے ہوئے ہے۔ تمام کردار اپنے مقدر سے لڑتے لڑتے ہار جاتے ہیں۔ ان کی ہر تدبیر الٹ ہو جاتی ہے کیونکہ بربادی، تباہی اور پھر فنا ہو جانا انسان کا مقدر ہے۔ وجودیوں کا دعویٰ ہے کہ انسان اپنے جذبات کا خود ذمہ دار ہے اور جذبے کی قدر کا تعین عمل کرتا ہے اس کا جواز مذہب میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ اگر دیکھا جائے تو "چلتا مسافر" میں تمام تر تباہی ایک جذبے کے تحت ہوئی۔ اس عمل کا کوئی جواز مذہب میں نہیں ملتا۔ سقوط ڈھاکہ کا تمام تر عمل جذبات پر مبنی تھا۔ جذبات اور ذاتی مفادات نے ایک مذہب کے پیروکاروں کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا تھا اور یوں الطاف فاطمہ حیات و کائنات کے اسرار و رموز سے پردہ اُٹھانے کی کوشش کرتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ الطاف فاطمہ "چلتا مسافر" (فیروز سنز لمیٹڈ ۱۹۸۷، لاہور، ۲۰۱۶)، ص:۸۱

۲۔ ایضاً، ص:۱۷۰

۳ شہزاد منظر، پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال، پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، اگست ۱۹۹۷ء، ص۱۰۷۔

۴ الطاف فاطمہ، چلتا مسافر، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص۱۲۵۔۱۸۲

۵ ایضاً، ص۱۹۷۔

۶۔ ایضاً ص۲۷۹۔

۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور ایڈیشن دہم، ۴۲۔۲۰۱۳ء، ص۲۷۴۔۲۶

۸۔ فلیپ چلتا مسافر، الطاف فاطمہ۔

۹۔ ناہید قمر، ڈاکٹر، اردو فکشن میں وقت کا تصور، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۰۸، ص۲۶۱۔